ڈاکٹر قرۃ العین طاہرہ
آئی ایم سی جی۔ ایف سیون ٹو، اسلام آباد

مولانا غلام قادر گرامی: ایک مطالعہ

Maulana Ghulam Qadir Gramee, is a prominent name for his scholarly works and poetic contributions especially in Classical Persian language. Maulana Gramee was born in Jalundhar and did Munshi Aalam and Munshi Faazal from Oriental College, Lahore. He also studied law and preferred teaching as profession but soon left it to serve in the police department. Due to lack of aptitude he further migrated to Hyderabad Deccan, where Nizam Deccan honoured. His stay in Deccan proved very creative and contributed a lot to Classical Persian poetry. His association began with Allama Muhammad Iqbal which lasted for 25 years, till his death. Both honoured each other and appreciated their respective literary and poetic achievements. This unique association generated a misconception that Gramee is Ustaad of Allama Iqbal. Allama Iqbal recognizes Gramee as the greatest Persian poet after Urfi and Naziri. Hafiz Jalundhary proudly claims that he was a pupil of Maulana Grammee.

مولانا غلام قادر گرامی کا شمار اربابِ علم و ذوق خصوصاً اقبال کے شیدائیوں میں ایک بلند مرتبہ شخصیت کے طور پر ہوتا ہے۔ وہ اگرچہ پنجابی تھے، لیکن فارسی شاعری کے حوالے سے شہرت رکھتے ہیں۔ مولانا گرامی ۱۸۵۴ء میں اور بعض تذکرہ نویسوں کے نزدیک ۱۸۵۶ء کے آس پاس جالندھر میں شیخ سکندر بخش کے گھر، ککے زئی خاندان میں پیدا ہوئے۔ والد نیل کی رنگائی کے پیشے سے وابستہ تھے۔ قرآنِ پاک ختم کیا تو انھیں ایک مکتب میں داخل کروا دیا گیا۔ فارسی زبان وادب سے دل چسپی کی بنا پر ان کے استاد خلیفہ ابراہیم نے انھیں اس کم عمری میں ملک الشعراء کا خطاب دیا۔ چودہ سال کی عمر میں لاہور آ کر اورینٹل کالج سے منشی عالم اور منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے، وکالت کے امتحان میں بھی کامیابی حاصل کی۔ مولانا محمد حسین آزاد، سید حسن بلگرامی کے نام خط میں ان کی علمی قابلیت کا اعتراف کرتے لکھتے ہیں۔

''گرامی کو میں خوب جانتا ہوں۔۔۔اور جس رنگ میں یہ لکھتا ہے اس میں آج اوّل درجے کا شاعر ہے۔ اس کی طبیعت خیال بند ہے۔ جلال اسیر، قاسم مشہدی اور ظہوری وغیرہ اسی طرز میں کہتے تھے۔'' [۱]

گرامی نے وکالت کے بجائے معلّمی کا پیشہ اختیار کیا، لیکن ان جیسا صاحبِ علم استاد، طالبِ علموں میں تو پسندیدہ ہوسکتا ہے، انتظامیہ کے لیے اسے ''برداشت'' کرنا مشکل تھا۔ امرتسر، کپورتھلہ اور لدھیانہ کے سرکاری مدرسوں میں فارسی

کے مدرّس رہے، ایک مرتبہ انسپکٹر آف سکولز نے ان کی جماعت کے معائنے کے بعد یہ رائے دی کہ استاد تو اچھا ہے، طالب علموں میں شعری ذوق پیدا کر رہا ہے لیکن نصاب کی طرف توجہ کم ہے۔ درس و تدریس سے دل کھٹا ہُوا تو کسی مہربان کے کہنے میں آ کر پولیس کی نوکری بھی کی لیکن گرامی پولیس کے محکمے میں نہ چل سکے۔ کشاکشِ روزگار سے تنگ ایک روز داتا دربار گئے کہ یہ مرجع خلائقِ خاص و عام ہے، رات گئے تک وہاں بیٹھے رہے، ایک طویل منقبت کہی، جس کی تضمین حضرت خواجہ معین الدین چشتی کا معروف شعر تھا۔

گنج بخش فیضِ عالم مظہرِ نُورِ خدا

ناقصاں را پیرِ کامل، کاملاں را رہنما

انھوں نے خواجہ معین الدین چشتی کی منقبت لکھی جو پیسہ اخبار اور ماہنامہ وکیل امرتسر میں شائع ہوئی۔ ایک نسخہ خانقاہ اجمیر شریف کے دیوان کو بھیجا۔ انھوں نے ایک طلائی تمغہ اور پٹکا ارسال کیا اور اشارتاً حیدرر آباد جانے کے لیے کہا۔[۲]

ایک رات خواب میں حضرت داتا گنج بخش کی جانب سے منقبت کی قبولیت کی نوید دی گئی اور تاکید کی گئی کہ حیدر آباد دکن کی فضا تمھارے لیے سازگار ہے۔

آقائے تسبیحی نے ''راہِ فردا'' کے عنوان سے کہی گئی منقبت فارسی پاکستانی و مطالبِ پاکستان شناسی میں درج کی ہے۔

'' منقبت حضرت خواجہ ء خواجگان قطب الاقطاب سند الموحدین خواجہ معین الدین حسن سنجری چشتی اجمیری قدس سرہ العزیز:

''انھوں نے حضرت علی ہجویری گنج بخش اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی شان میں منقبتیں لکھی تھیں، خواجہ اجمیری کی منقبت، پیسہ اخبار میں شائع ہو کر اجمیر پہنچی، جسے وہاں کے مجاورِ خاص نے حضرت خواجہ معین الدین اجمیری کے عرس کے موقع پر پڑھا اور وہ بہت مقبول ہوئی، مجاور صاحب نے انھیں خط کے ذریعے حیدرآباد جانے کا مشورہ دیا۔ رام پور سے گرامی ریاست پٹیالہ چلے گئے۔ وہاں کے وزیر اعظم خلیفہ محمد حسین صاحب نے ان کا کلام سن کر کہا کہ آپ جیسے عظیم شاعر کی قدر حیدر آباد دکن میں ہوگی، آپ حیدر آباد چلے جائیں۔ جب گرامی رام پور میں تھے تو چند ایرانی تاجروں نے مشاعرے میں ان کا فارسی کلام سنا تھا،، وہ تُجّار جب بسلسلہ ء تجارت حیدر آباد چلے گئے تو وہاں انھوں نے روسا سے گرامی کی غزل گوئی کی تعریف کی، یہ بات کسی طرح نواب محبوب علی خان والیء دکن کے سمعِ مبارک تک پہنچی اور بادشاہ نے عزت کے ساتھ گرامی کو اپنے دربار میں طلب فرمایا۔''[۴]

یہ وہی دَور تھا کہ جب داغ دہلوی، نواب محبوب علی خان کی اردو شاعری کی اصلاح پر مامور تھے اور قدر بلگرامی (۱)، فارسی شاعری دیکھا کرتے تھے۔ مولانا گرامی، قدر بلگرامی کے انتقال کے بعد اسی منصب پر فائز ہوئے اور یوں نظام دکن محبوب علی خان کی ریاست سے وابستگی ہوئی۔ اپنی خلاقانہ طبعیت اور قادر اکلامی کے سبب شاعرِ خاص کا منصب عطا ہُوا اور چند سال بعد ہی ملک الشعراء کا خطاب پایا۔ اس طرح آٹھ سال کی عمر میں اپنے ابتدائی استاد خلیفہ ابراہیم کی جانب سے ملنے والے اس خطاب کی توثیق ہوگئی۔ تمام زندگی وہیں گزاری اور ہر شعری امتحان میں کامیاب ٹھہرے کہ اکثر فی البدیہہ

قصیدہ کی فرمائش ہوتی اور آپ اس پر پُورا اترتے ۔گرامی کا قیامِ دکن کا زمانہ نہایت آسودگی کا تھا۔نواب داغ دہلوی بھی وہیں موجود تھے ، دونوں اساتذہء فن میں چپقلش رہتی تھی ۔ کہیں سرِ دربار نظام کو مخاطب کر کے داغ نے گرامی کے بارے میں انتہائی تحقیر آمیز لہجے میں کہہ دیا کہ بڑا شاعر بنا پھرتا ہے کہیں سے فارسی شعراء کے دوا وین اٹھا لایا ہے اور اپنے نام سے پڑھ کر اپنا سکّہ جما لیا ہے ۔مولانا عبد الحلیم شرر نے برسبیلِ تذکرہ ، یہ بات گرامی سے کردی ، انھیں آگ تو لگنی ہی تھی ، اگلے ہی موقع پر انھوں نے بھرے دربار میں داغ کی ہجو کہہ ڈالی ، سننے والوں نے لطف تو بہت لیا لیکن جو صورتِ حال زیادہ ہی نازک دیکھی تو صلح صفائی کروادی ۔داغ ہی کے مشورے پر بغرض امتحان نظام نے حافظ کا ایک مصرع گرامی کے سامنے رکھا کہ دیکھیں آپ کیا کہتے ہیں ، گرامی نے فی البدیہہ غزل کہہ ڈالی .غزل کا ہر شعر ہی بیت الغزل معلوم ہوتا تھا ، درباریوں کے علاوہ نظام دکن ، محبوب علی خان نے بے ساختہ ایک ایک شعر پر داد دی اور جن کے چہرے اترنے تھے، اتر گئے ۔ ۵

انھوں نے نواب محبوب علی خان کی مدح میں متعدد فارسی قصائد لکھے جو نظیری و عرفی کے قصائد کی طرح پُر شکوہ اور ندرتِ خیال اور عمدہ صنعت گری کے حامل ہیں ، ایک مرتبہ بہاریہ قصیدہ پر نواب صاحب نے قیمتی موتیوں کا ہار بخشا تو داغ نے اسے بہت زیادہ محسوس کیا ۔ ۶

نواب محبوب علی خان کے وزیر اعظم نے ایک مرتبہ انھیں بتایا کہ گرامی آج کل بہت پریشان ہیں۔ پنجاب میں ان کی بہن کی شادی طے ہوچکی ہے ۔ اہلِ پنجاب اپنی بہنوں بیٹیوں کو شادی میں سونے کے ٹھوس زیورات دیا کرتے ہیں گرامی میں اتنی سکت نہیں اس لیے بہت آشفتہ حال اور پریشان ہے ۔نواب صاحب نے اسی وقت حکم جاری کیا کہ گرامی کو پانچ سیر سونا دے دیا جائے تا کہ اپنی بہن کے لیے خالص سونے کے زیورات بنوا سکیں ۔ ۷

اسی حوالے سے ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے ایک دلچسپ انکشاف کیا ہے ۔'' ایک مرتبہ جامی کی اس غزل لکھنے کے عوض دو سیر پختہ سونا انعام ملا:

صبحدم چوں رخ نمودی شد نمازِ من قضا

سجدہ کی باشد روا چوں آفتاب آید بروں

یہ انعام لے کر وہ جالندھر آئے اور ہشیار پور کی نوراں بھری بنت شیخ قمر الدین سے ان کی شادی ہوئی۔ بعد میں بیوی کا نام اقبال بیگم رکھا۔'' ۸

صادق نسیم نوابانِ دکن کی دیگر مصروفیات کا نقشہ دلچسپ انداز میں کھینچتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایسا ہُوا کہ نواب دکن کی سواری اس خاص بازار سے گزر رہی تھی ایک چاند چہرہ نگاہوں کو بھا گیا ، اب کیا تھا، نواب صاحب نے اسی مقام کو اپنا مستقر بنا لیا ۔ بات پریشان کن تھی کہ سرکار دربار کا سارا دفتر وہیں سے چلنے لگا ۔عمّال ، وزیر، انتظامیہ سب عاجز کہ ہر حکم نامے پر دستخط کے لیے سبھی کو اُس بزم میں جانا پڑتا تھا ۔مولانا گرامی سے مشورہ کیا گیا کہ کیا تدبیر ہو کہ نواب صاحب وہاں سے واپس آجائیں ۔گرامی نے صرف ایک شعر لکھا اور کہا کہ اسے نواب کی خدمت میں پیش کر دیا جائے ۔شعر یہ تھا۔

تو شاہِ شہاں عشق و مستی کجا است

تو ظل اللہ ای بت پرستی کجا است

شعر کا پڑھنا تھا کہ نواب صاحب نے بزمِ نشاط چھوڑی اور سوئے دربار روانہ ہوئے۔[۹]

آپ میر عثمان علی خاں کے دَور میں بھی دکن دربار سے وابستہ رہے۔گھر کی یاد ستاتی تو جالندھر آجاتے۔ اہلِ جالندھر کی خوشی اور فخر دیدنی ہوتا۔ مشاعرے منعقد کیے جاتے۔ ان کی پُر لطف محفل ہر خاص و عام کے لیے دل کشی کا باعث ہوتی۔۔ نظام دکن کے انتقال کے بعد وطن واپس آگئے۔ جالندھر کے قریب ہی ایک چھوٹا سا خوبصورت شہر ہوشیار پور ہے۔ گرامی کی اہلیہ اقبال بیگم کا تعلق ہوشیار پور سے تھا، گرامی کی صحبت نے ان کی شعری صلاحیتوں کو جلا بخشی، شاعری میں ترک تخلص کرتی تھیں، بزمِ گرامی کے مشاعروں میں ان کی بھیجی گئی غزل بھی پڑھی جاتی اور داد پاتی۔ ہوشیار پور میں بیوی کے نام ایک حویلی ''سرجلوہء اقبال'' تعمیر کروائی تھی اکثر و بیشتر اس حویلی ''اقبال منزل'' میں قیام رہتا۔

حفیظ جالندھری نے ان کی شخصیت کا جو خاکہ کھینچا ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں۔

''ایک دن اپنے دو ہجولیوں کے ساتھ میرا گزر ایک محفل سے ہوا، جس کے درمیان ایک بلند و بالا بھاری بھرکم، لحیم شحیم معزز صورت شکل کا آدمی'' منہ زبانی'' کوئی نظم پڑھ رہا تھا، نظم کی زبان، بعد میں معلوم ہُوا کہ فارسی تھی، میرے لیے اجنبی اور ناقابلِ فہم تھی۔ نظم پڑھنے والے کا چہرہ با رعب تھا۔ گھنی اور بیضوی داڑھی جس میں ہلکی اور نا معلوم سی مانگ نکلی ہوئی تھی سر پر ہلکے پیازی رنگ کی ململ کا بھاری اور گھیر دار پگڑ بندھا تھا، ایک سادہ شاید ہلکے نسواری رنگ کی شیروانی بدن پر تھی نیچے چست چوڑی دار سفید پاجامہ اور پیروں میں سیاہ پیٹنٹ چمڑے کا پمپ۔''[۱۰]

اقبال اور گرامی کی دوستی کوئی کل کا قصہ نہ تھی کوئی بیس پچیس سال پرانی تھی، ابتدا میں اقبال اردو میں ہی شعر کہتے تھے، بعد میں اقبال کا فارسی شاعری کی طرف رجحان ہُوا، اقبال خود آگاہ و خود شناس شاعر تھے۔ اقبال جان چکے تھے کہ صرف اردو میں ہی کہہ کر وہ اپنا مدعا پورا نہ کر سکتے تھے، وہ آفاقی و کلاسیکی شاعر تھے، ان کی شاعری وہ جوئے آب تھی جس کے آگے بند نہیں باندھے جا سکتے۔ اقبال کے نزدیک جغرافیائی حدود کوئی معنی نہ رکھتی تھیں، جب انھیں یقین ہو گیا کہ اردو شاعری ان کے عالم گیر پیغام کے لیے ساز گار نہیں، بیشتر اسلامی ممالک عربی زبان سے وابستگی رکھتے ہیں یا فارسی سے، پھر مغربی مستشرقین بھی فارسی سے آگاہ تھے۔یوں اقبال نے محسوس کیا اگر وہ فارسی اپناتے ہیں تو ان کے افکار و نظریات، براہِ راست ایک وسیع تر حلقے تک پہنچ سکیں گے۔ اقبال کے فکر و نظر اور دل و دماغ میں پیدا ہونے والے احساسات اور خیالات کو، ان کے نظریات اور فلسفہء حیات کو ایک بہترین اسلوب کی ضرورت تھی۔[۱۱]

ایک اہم بات یہ بھی تھی کہ فارسی میں شعر گوئی ان کا انتخاب نہ تھا بلکہ مجبوری تھی کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ شعر مجھ پر اسی زبان میں اترتا ہے۔ فارسی اقبال کی مادری نہیں بلکہ اکتسابی زبان تھی، انھیں کسی ایسے فارسی دان کی تلاش تھی، جو ان کی کہی ہوئی بات کے فنی پہلوؤں پر توجہ دے سکے۔ مشورے کے لیے ارد گرد نگاہ دوڑائی گئی تو ایسے میں انھیں ایک ہی شخص دکھائی دیا۔۔۔جس کی مادری زبان فارسی نہیں بلکہ انھی کی طرح پنجابی تھی، دونوں میں اگر کوئی قدرِ مشترک تھی تو یہ کہ دونوں نے فارسی اساتذہ کے کلام کا بغور مطالعہ کر رکھا تھا، سینکڑوں فارسی اشعار ازبر تھے، بلند ذوقِ شعر رکھتے اور حسنِ فن پر توجہ کو

اہم جانتے تھے ، ورنہ دونوں کا کلام دو مختلف انتہاؤں سے متعارف کرواتا ہے ۔ گرامی کے موضوعات ان کی زندگی کے آخری دور تک روایتی رہے جبکہ اقبال کی فکر حدود و قیود سے ماورا تھی، جس کا اعتراف گرامی نے انجمن حمایتِ اسلام کے جلسوں میں اور دیگر مقامات پر برملا کیا۔ اقبال کے بعض اشعار پر تضمینیں بھی لکھی ہیں۔

الہام بود ہمہ کلام ِ اقبال　　شہبازِ معانی ست بدام ِ اقبال
سر بر خط او نہد گرامی کہ قضا　　زد سکہء خسروی بنام ِ اقبال
در دیدہ معنی نگہاں حضرت اقبال　　پیغمبری ِ کرد و پیمبر نتواں گفت
جام جم گیر کہ در میکدہ خوش گفت اقبال　　''قسمت بادہ با اندازہ ء جام اینجا است''

جلوہ افروز گرامی ست بخاکِ پنجاب
آفتابست' ولی بر لب ِ بام است اینجا

ناقدین اس بات پر متفق ہیں کہ گرامی کی تخلیقات کو ایران کے کسی بھی بڑے شاعر کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

''گرامی از دوستان یک رنگ اقبال بود ، اقبال پیوستہ در بارہ ء شعر فارسی خود با گرامی مشورتھای وی را می پذیرفت۔'' [۱۲]

اس دور میں یہ غلط فہمی بھی بعض اذہان میں پیدا ہوئی کہ علامہ اقبال گرامی کے شاگرد ہیں ۔

ایک مرتبہ خواجہ حسن نظامی کے ہفت روزہ ''توحید'' کے خواجہ نمبر ۸ جون ۱۹۱۳ء میں شعری انعامی مقابلہ منعقد ہُوا جس کے منصفین میں علامہ اقبال بھی شامل تھے اور اس مقابلے میں گرامی نے اول انعام حاصل کیا تھا۔ [۱۳]

پھر اقبال و گرامی کے متعلق عبداللہ قریشی بھی اس امر کی نفی کرتے ہیں کہ دونوں میں کوئی استادی شاگردی کا رشتہ تھا۔ دونوں کے تعلقات خالص دوستانہ نوعیت کے تھے ۔ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے پر، اثر انداز ہوتی تھیں ۔ خطوطِ اقبال بنام گرامی کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ علامہ اقبال گرامی کی تنقیدی موشگافیوں کو مدِ نظر رکھتے ، فنی مسائل پر بحث ومباحثہ کرتے ، الفاظ کے مناسب استعمال پر سوچ بچار کرتے ، ان کے اشارے کنائے سمجھتے ، لیکن ان کی ترامیم سے اتفاق نہ کرتے اور انھیں قائل کر لیتے ۔ [۱۴]

ڈاکٹر سیّد تقی عابدی کی تحقیق کے مطابق اقبال چیدہ چیدہ اشعار پر رائے لیتے تھے۔ اصلاح پسند ہوتی تو ٹھیک ورنہ ان کی تنقید یا اصلاح پر کھل کر اعتراض کرتے اور سند کے ساتھ بات کرتے ، گرامی کے اشعار پر بھی تنقید کرتے اور ان کے اشعار کی ایسی اصلاح کرتے کہ اور نکھر کر سامنے آتے ۔ ان خطوط میں جو بے تکلفی اور شوخی ہے یا فلسفہ، تصوف، تفسیر اور فارسی شاعری پر بحث و مباحثہ ہے، وہ کہیں سے استاد شاگرد کے رشتے کو ثابت نہیں کرتا۔ پھر گرامی بھی اقبال کو عظیم شاعر تسلیم کرتے ہیں، چناں چہ اپنے ایک خط میں خان نیاز خان کو لکھتے ہیں '' ڈاکٹر اقبال مجدّد ہیں ۔ فلاسفر ہیں ، ادب آموز ہند ہیں ۔ گرامی ان کا سا دماغ کہاں سے لائے ۔ دو تین شعر کہتا ہوں ، ڈاکٹر صاحب کی خدمتِ عالی میں بھیج دیجیے ۔ ان کی داد سمیٹیے دوسروں کی داد عین بے داد۔'' [۱۵]

دوسری جانب اقبال گرامی کی موجودگی میں شعر پڑھتے تو اس تیقن کے ساتھ کہ انھیں سمجھنے والے موجود ہیں۔جس محفل میں عبد القادر یا گرامی موجود ہوتے، اقبال نظم سناتے ہوئے شعر میں مستعمل لسانی تشکیلات اور رفعتِ خیال کی طرف متوجہ کرتے تھے۔گرامی کو بطور خاص مخاطب کرتے اور دونوں اساتذہ ءفن، شعر کی لفظی و معنوی جہات پر کھل کر بحث کرتے اور سُننے والے ان موشگافیوں سے لطف بھی لیتے اور بہت کچھ حاصل کر کے اُٹھتے۔ ۱۶

علامہ اقبال کے گرامی کے نام نوے خطوط جو ۱۹۱۰ء سے ۱۹۲۷ء تک کے عرصے میں لکھے گئے ،اس تعلقِ خصوصی کے آئینہ دار ہیں جو انھیں گرامی سے تھا۔ جناب محمد عبداللہ قریشی نے مکاتیبِ اقبال بنام گرامی کی ترتیب وتسوید کی ذمہ داری نبھائی۔ان خطوط کے مطالعے سے علم ہوتا ہے کہ علامہ، مولانا گرامی کو کن کن القابات سے یاد کرتے ہیں، ان میں بے تکلفی اور محبت بھی ہے اور احترام وعقیدت بھی، بابا نومی، بابا گرامی، ڈیر گرامی، ڈیر مولانا گرامی، پیرِ مغاں، پیرِ کہن سال، حضرتِ اقدس وغیرہ۔

گرامی اولاد سے محروم رہے۔ان کی شادی اور پھر دوسری شادی کے بھی قصے کیا کیا نہ مشہور ہوئے، اس وقت ان کا محل نہیں۔ فارسی دیوان اور رباعیات کا مجموعہ ان کی معنوی اولاد ہیں۔گرامی نے اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا، لیکن فطری بے نیازی نے کبھی اپنے کلام کو سنبھال کر یکجا رکھنے نہ دیا۔ان کی وفات کے بعد ان کے چاہنے والوں نے جن میں ان کی بیوی اقبال بیگم، حضرت میاں علی محمد سجادہ نشین بستی نو ہوشیار پور، ان کے شاگرد حفیظ جالندھری اور مولوی عزیز الدین عظامی (۲) نمایاں ہیں۔ دیوان فارسی اور رباعیات کے دو الگ الگ مجموعے شائع کیے، جو، اب نایاب ہیں۔

"دیوانِ گرامی، دوسو سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں زیادہ تر غزلیات ہیں اور وہ دیوان کے ایک سو دو صفحات پر پھیلی ہوئی ہیں اور ردیف وار ترتیب دی گئی ہیں مگر اس سے ان کے ذہنی ارتقاء کا کچھ اندازہ نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ اندازہ ہوسکتا ہے کہ یہ کس زمانے کا کلام ہے۔ان کی بیشتر غزلیں فارسی اساتذہ کی زمینوں میں کہی گئی ہیں، ان کے مقطعوں میں بھی اکثر فارسی شعراء مثلاً نظیری، ظہوری، خسرو، صائب، ظہیر فاریابی وغیرہ کے تخلص برتے گئے ہیں۔ اس کے بعد مثنویاں ہیں، جو اکثر نامکمل ہیں۔۔۔ کچھ مختصر نظمیں مثنوی کی ہیئت میں لکھی ہیں۔ کچھ نظمیں بزرگانِ دین اور اولیاء اللہ کی منقبت میں ہیں۔۔ ایک ترجیع بند، دو مسدس اور ساقی نامہ ہے۔ اس کے بعد کچھ قصائد ہیں۔گرامی کا مزاج قصیدہ گوئی سے مناسبت نہ رکھتا تھا۔کل چار قصیدے کہے ہیں، دو تو بالکل مختصر سے خطابیہ انداز کے ہیں، البتہ دو نظام دکن کی سالگرہ پر لکھے گئے ہیں، جن کی نوعیت روائتی قصائد کی ہے۔آخر میں چند قطعات وفردیات۔۔۔ رباعیاتِ گرامی کے نام سے ان کا جو دوسرا مختصر مجموعہ چھپا ہے وہ غزلیات کے بعد سب سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے یہ مولانا کا آخری عمر کا کلام ہے۔۔۔یہ رباعیاں زیادہ تر واردات و مسائلِ تصوّف کے بیان تک محدود ہیں۔بعض رباعیوں میں منقبت اور نعت بھی لکھی ہے۔ کچھ رباعیات بعض واقعات کی طرف اشارے کرتی ہیں،۔ چند رباعیاں دوست احباب کے متعلق ان کے تاثرات کو ظاہر کرتی ہیں۔صوفیانہ رباعیات تعداد میں زیادہ ہیں۔۔۔گرامی کی رباعیات محض صوفیانہ موضوعات کا غیر شاعرانہ اظہار نہیں ہیں، ان میں فنِ رباعی نگاری کی جملہ خصوصیات موجود ہیں۔

یک قطرہ ز خمخانہ ء رازم دادی

یعنی خبر از ناز ونیازم دادی
صورت گیرد چگونہ عصیان از من
کز صورتِ خویش امتیازم دادی [۱۷]

طویل نظم کے لیے شعراء مثنوی کی ہیت پسند کرتے ہیں، مولانا نے بھی دو ناتمام مثنویاں یادگار چھوڑی ہیں، ایک مولانا جلال الدین رومی او دوسری ، مولانا غنیمت کنجاہی کی مثنوی ''نیرنگِ عشق'' کے جواب میں ''خرابات جنوں'' کے عنوان سے لکھی ۔ مثنوی مولانا غنیمت جونولکشور پریس کانپور سے جولائی ۱۸۸۰ء میں شائع ہوئی (۳) اس مثنوی نے اپنے عہد کی شعروسخن کی فضا میں ہلچل پیدا کر دی ۔ اس کے تتبع میں کئی شعرا نے مثنویاں کہنے کی کوشش کی لیکن اس پایہ تک نہ پہنچ سکے ۔ گرامی کی زندگی اگر وفا کرتی تو غزل و رباعیات کے علاوہ فارسی مثنوی گوئی میں بھی وہ اپنی مثال آپ ٹھہرتے۔

گرامی نے مرثیے بھی لکھے ہیں:

''وی سہ مرثیہ نیز سرودہ است ، یکی در رثائی حاکم الدولہ، دیگری بہ نام نالہء پدر در فراق پسر در مرگ سعید احمد فرزند شیخ فضل محمد وسومی در رثائی خویش کہ چون از مرض قند در گذشت، بر لوح مزارش در ہوشیار پور حک کردند۔'' [۱۸]

ان کی عمر کا بڑا حصہ ہوشیار پور ، جالندھر، حیدر آباد اور لاہور میں گزرا ۔ ایران کا کبھی سفر نہ کیا لیکن فارسی زبان و ادب کا مطالعہ بے حد وسیع تھا ، فارسی شاعری کے اسرار و رموز اور صنائع وبدائع سے آگاہی نے انھیں ایک بلند وارفع مقام عطا کیا تھا۔ خوش ذوق وخوش فکر شاعر تھے ۔ قدیم کلاسیکی شاعری کے کامل اللفن اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں ۔ ان کا رنگِ شعر عہد اکبر کے اساتذہ کا تھا۔ جس شخص کی قوتِ حافظہ کا اعتراف تمام اکابرین نے کیا ہو، جس کی قادر الکلامی ، شعری محاسن، الفاظ ومحاورات کے برتنے کا شعور، تراکیب کی تشکیل کا مجتہدانہ انداز باعث تقلید ہو ایسی شخصیت سے ست الوجودی اور کاہلی کی توقع بظاہر عبث ہے لیکن گرامی کی ذات سے بہت سے ایسے واقعات منسوب ہیں جن میں ان کی آرام پسند طبعیت کا تذکرہ کیا گیا ہے ۔ اقبال انھیں بڑے اصرار سے بلاتے اور ان کی خواہش ہوتی کہ بابا گرامی ان کے ہاں زیادہ سے زیادہ قیام کرے ، لیکن انھیں ہوشیار پور سے لانا ایک کٹھن مرحلہ ہوا کرتا اور جب بیگم گرامی انھیں واپس بلانا چاہتیں تو جانا مشکل ہوجاتا۔ اقبال کو انھیں روکنے کے طریقے بھی بہت آتے تھے ، کبھی کسی رباعی کا کوئی مصرع تو کبھی کوئی ترکیب وضع کرنے کی کاوش کا بہانہ بنا لیا جاتا۔[۱۹]

یادداشت خدا کا بہترین عطیہ، جس سے گرامی نے بہت فائدہ اٹھایا ، اگر اچھا شعر سنتے تو وہ ان کے لوحِ حافظہ پر ہمیشہ کے لیے رقم ہوجاتا۔ فارسی اساتذہ کا کلام گویا حفظ تھا۔

''گرامی شاعر توانای فارسی بد ودر حافظہ قوی وی ہزار ہای اشعار خوب فارسی محفوظ بود۔'' [۲۰]

مولانا گرامی مرحوم کا ذکر آیا تو فرمانے لگے کہ کسی کو چاہیے کہ ان کے ہمراہ رہ کر ان کا کلام لکھتا جائے، حافظہ نہایت تیز ہے انھیں اپنا سارا کلام زبانی یاد ہے مگر لکھنے کی طرف توجہ کم ہے کہیں ایسا نہ ہو گذر جائیں اور ساتھ ہی اپنا کلام لے جائیں ۔ [۲۱]

علامہ اقبال کا اٹل گڑھ ضلع ہوشیار پور سے تعلق رکھنے والا ملازم علی بخش، تیرہ چودہ برس کی عمر سے اقبال کی خدمت کرتا رہا تھا سوائے ان چند سالوں کے جو علامہ اقبال نے یورپ میں گزارے، آخر میں تو بندہ و آقا کی تمیز ختم ہوگئی تھی۔۲۲

علی بخش گرامی کا ہم وطن تھا اور گرامی کا مزاج شناس بھی۔ ان کے کھانے پینے، سونے جاگنے، پسند ناپسند، سستی و کاہلی، شعرگوئی کی کیفیت، قوتِ حافظہ کی بے پناہ صلاحیت، سب کا گواہ ہے۔ اسد ملتانی بھی ان کی یادداشت اور قوتِ حافظہ پر رشک کرتے ہیں۔

''فارسی زبان کے سلسلے میں مولانا گرامی کا ذکر آ گیا، ان کے غیر معمولی حافظے کی تعریف بیان کرتے ہوئے بتایا کہ کسی کو اشعار یا غزلیں یا نظمیں یاد ہوں گی مگر مولانا کو مثنویاں تک مسلسل یاد ہیں، وہ اس وقت اسی کمرے کے ایک گوشے میں دراز تھے، فرمایا: ''لیجیے ابھی ان کے حافظے کا کرشمہ دیکھیے۔'' یہ کہہ کر مولانا کو آواز دی۔ وہ اٹھ بیٹھے۔ کہا کہ مولانا حضرت نظامی نے وہ کیا فرمایا ہے:

ز گرد بیاباں بیابان گرد

بس اس مصرع کا سننا تھا کہ مولانا گرامی دونوں ہاتھوں کی شہادت کی انگلیاں اٹھا کر جھومنے لگے اور کہنے لگے ''اللہ اللہ۔ اللہ اللہ'' اس کے بعد ایک دو بار اس مصرع کو دہرایا اور پھر مثنوی وہیں سے شروع کر دی۔ مزے لے لے کر شعر پر شعر پڑھتے گئے۔ میں نے مولانا گرامی کو پہلی اور آخری بار جھومتے دیکھا۔ ان کا مُنڈا ہوا سر، اٹھی ہوئی انگلیاں، نیم وجد کا عالم، جھوم جھوم کر زور دار اور پُر جذب آواز کے ساتھ شعر پڑھنا، یہ تمام مناظر اب تک میرے حافظے پر نقش ہے یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا اور شاید بہت دیر تک جاری رہتا لیکن آخر حضرتِ علامہ نے نہایت حسنِ اسلوب سے موضوع بدل کر گفتگو کا رخ کسی اور طرف پھیر دیا۔''۲۳

حفیظ جالندھری بھی گرامی کے شعر پڑھتے ہوئے جذب و وجد کے گواہ ہیں۔ جو کیفیت شعر پڑھ کر ان پر طاری ہوتی تھی ان سے شعر سن کر سامع بھی اسی کیف میں مسحور ہو کر رہ جاتے۔

''یہ بزرگ قدرے جھک کر کھڑا تھا'' منہ زبانی'' کچھ پڑھ رہا تھا نہ جانے وہ کیا کہہ رہا تھا کہ جس کو سن سن کر محفل کا ہر فرد جن میں لمبی لمبی داڑھیوں والے بوڑھے اور داڑھی منڈے جوان بھی تھے، ذبح کی ہوئی بٹیروں کی طرح تڑپ تڑپ جاتے تھے۔ پہلے وہ ایک مصرع پڑھتا پھر اسی کو دہرا دیتا، ساتھ ہی دوسرا مصرع اپنی آواز پر مزید زور دے کر پڑھتا، اس طرح کہ ہر لفظ پر اس کی آواز تاکید اور اصرار کرتی ہوئی معلوم ہوتی، دوسرے مصرع کو ختم کرتے ہوئے وہ اپنے بھاری پگڑ بندھے ہوئے سر کو پے بہ پے اس طرح حرکت دیتا جیسے کسی کو تاکید کے کلمات کہہ رہا ہو، ساتھ ہی اپنے داہنے ہاتھ کی تین انگلیاں مٹھی کی طرح بند کر کے انگشتِ شہادت اور انگوٹھے کو ملا کر اور پھیلا کر فرش کی جانب جھکتا اور خلا میں اس انداز سے جنبش دیتا جیسے اپنی بات پر وثوق سے اصرار کر رہا ہو۔''۲۴

یہ تحریر اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ مذکورہ شخصیت کو اپنی ذات پر اپنے علم پر، اپنی زبان دانی پر اور اپنے شعر پڑھنے کے انداز پر پُورا اعتبار اور اعتماد ہے، وہ جانتا ہے کہ اس کہ منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کیا معنی رکھتے ہیں، ان کا تاثر

اور تاثیر، سُننے والوں کے دلوں سے فراموش نہیں کی جاسکتی ۔ الفاظ کی شعبدہ گری کیا ہوتی ہے، الفاظ ان کے ہاتھوں میں آ کر کس طرح زندگی پاتے ہیں، گرامی اس امر سے بخوبی آگاہ تھے۔

محبت ایں چنیں عاشق نوازی ایں چنیں باید
زدی، کشتی ، شکستی،سوختنی ، انداختی، رفتی

جنھوں نے علامہ اقبال کو فارسی شاعری تحت اللفظ پڑھتے سُنا ہے، وہ کہتے ہیں کہ علامہ کا انداز گرامی کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

''ان کا اسلوب البتہ سبکِ ہندی کے بیشتر شعرا سے زیادہ رواں اور ہموار ہے ۔ انھیں محاورہ بندی کا بہت شوق ہے ۔ ان کی بیشتر غزلیات میں جو روانی اور سلاست ہے وہ بعض کمیوں کی تلافی کر دیتی ہے اور وہ اس طرح کے شعر لکھنے پر قادر دکھائی دیتے ہیں ۔

ما غلط، عقل غلط، کار غلط، راہ غلط
خطِ پیشانیٔ ما سر ِ خط گمراہی ء ما
کار از دست شد و دست بکارے نزدیم
داد از غفلت ِ ما آہ ز کوتا ہی ء ما[۲۵]

مولانا گرامی فارسی تشبیہات ، استعارات ، علائم ، تلمیحات ، ضرب الامثال ، محاورات ، روز مرّہ ، سے اس قدر آگاہ تھے کہ انجان شخص کے لیے یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ شخص ایرانی تہذیب وتمدّن اور اندازِ معاشرت سے بظاہر کوئی علاقہ نہیں رکھتا ۔ گرامی نے بہت سے اساتذہ کی زمینوں میں غزلیں کہیں اور کامیاب رہے۔ جدید فارسی سے انھیں کچھ علاقہ نہ تھا ۔ کلاسیکی فارسی ہی میں لکھتے اور تراکیب وضع کرنے میں درجہء کمال کو پہنچے ہوئے تھے ۔ اپنے ہی کہے ہوئے اشعار پر گہری ناقدانہ نگاہ ڈالتے ۔ قطع و برید میں لگے رہتے ۔ لفظوں سے کھیلنے کا فن خوب جانتے تھے۔

نشان در بی نشان گم شد مکان در لا مکان گم شد
قیامت بر سر آورد آن باین و این بآن گم شد
نہانش را عیان گفتم،عیانش را نہان گفتم
عیان اندر نہان گم شد نہان اندر گم شد
بر آن بودم کہ از سرّ دہانش نکتہ بر خوانم
سخن تا بر زبان آمد، زبان اندر دہان گم شد
بصحرای محبت گم شدن باری عجب نبود
درین رہ ای حریفان، کاروان در کاروان گم شد

گرامی از نگاہی دل زدستم برد آن کافر
دل رمز آشنا آخر بچشم ِ نکتہ دان گم شد [۲۶]

وہ غزل کے شاعر تھے، لیکن آخر عمر میں رباعیات کی طرف توجہ ہوگئی تھی۔

علامہ اقبال کی نظر میں گرامی کا کارنامہ یہ غزل تھی۔

شب ہائے وصل و گوشہء چشمِ عنایتے — مائیم و زلف ِ یار و مسلسل حکایتے
عصیانِ ما و رحمت ِ پروردگار ِ ما — ایں را نہایتے نہ آں را نہایتے
از صبر و شکر نے سخنے نے ترانہء — الا چکدز حضرتِ انساں شکایتے
ہاں وارثی بنکتہء مضمون باغِ خلد — خوانی اگر ز مصحف ِ رخسار آیتے

تا چند امتحان تغافل تبسمے
دیرینہ بندہ ایست گرامی رعایتے

علامہ اقبال نے اس غزل کے بیت الغزل عصیان ِ ما و رحمتِ پروردگار ِ ما۔۔۔کو بہت مقامات پر احباب کو لکھے گئے خطوط میں بھی اور بالمشافہ بھی سراہا ہے۔

اقبال اور گرامی میں ایک قدرِ مشترک عشق رسول ﷺ کا ہونا بھی تھا۔

''گرامی برِصغیر پاک و ہند میں فارسی کے آخری استاد تھے جو کمال کی غزل کہتے تھے اور ان کی دھاک پورے ہندوستان میں تھی۔ بطور نمونہ ان کی غزل کا ایک شعر ملاحظہ فرمایئے:

خموشی باتکلم در ستیزہ
تبسم درمیانش ریزہ ریزہ

گرامی کبھی کبھی نعت کے مقدس موضوع کو اتنے پیار سے ادا کرتے کہ اس میں غزل کی آمیزش سی نظر آتی اور نعت کا تقدس بھی برقرار رہتا۔

گویند کہ آں سروِ رواں سایہ نداشت
زیں طرفہ کہ عالم ہمہ در سایہ اوست [۲۷]

حضور ﷺ نے فرمایا، جس نے خواب میں میری زیارت کی گویا اس نے زندگی میں مجھے دیکھا۔

''.....ایسا ہی ایک خواب کئی برس پہلے جالندھر کے آخری ممتاز فارسی گو شاعر غلام قادر گرامی نے دیکھا اور پھر اسے نظم کر کے اپنے ایک شاگرد کو وصیت کی کہ یہ اشعار مرے لوحِ مزار پر کندہ کروا دیے جائیں۔ شاگرد اپنے استاد کے انتقال کے وقت شہر سے باہر تھا چنانچہ گرامی اپنی زوجہ کے خواب میں آئے اور ان اشعار کو کندہ کرانے کی تلقین کی۔

بگیرم دامن آن سید لولاک ﷺ در محشر

کہ محشر برنتا بد تاب ِ حسن بے حجابش را
شبی در خانہ زی آں امام ِ انبیا ﷺ آمد
قضا گیر و عنانش راہ قدر گیرد رکابش را
قضا گیردقدر گیرد ازل گیرد ابد گیرد
رکابش را عنانش را عنانش را کابش را
سوار فلک شد ماہ ِ فلک آمد عناں گیرش
رکابش بوسہ بر پا زد ، فلک بو سد رکابش را
گرامی در قیامت آں نگاہ مغفرت خواہد
کہ در آغوش گیرد جرمہائے بے حسابش را [۲۸]

یہی بات مکاتیب گرامی بنام اقبال میں بہ انداز دگر ملتی ہے ، مؤلف کے نزدیک گرامی نے وفات سے چند روز پہلے ایک رباعی اور نعت کے چھ اشعار لکھ کر وصیت کی کہ انھیں لحد میں ان کے ساتھ رکھ دیا جائے۔ موت کا سانحہ ہوش اڑا دیتا ہے ، کسی کو اس وصیت کا خیال نہ رہا ، تدفین کے بعد یاد آیا تو سبھی رنجیدہ ہوئے کہ مولانا کی وصیت پر عمل نہ کیا جا سکا۔ ایک ماہ بعد بیگم گرامی نے خواب دیکھا جس میں گرامی انھیں تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ میری بخشش کی فکر نہ کرو ، سردار محمد سے کہو کہ یہ اشعار دہلی سے کندہ کرا کے لوحِ مزار پر لگا دے ۔ سردار محمد دہلی سے ہوشیار پور آئے اور سرخ پتھر پر یہ اشعار اور رباعی کندہ کروا کر قبر کے سرہانے لگا دی۔ یوں گرامی کی وصیت پوری ہوئی ، رباعی یہ تھی ۔

خاور دمد از شبم باایں تیرہ شبی
کوثر چکد از لبم باایں تشنہ لبی
اے دوست ادب کہ در حریمِ دلِ ماست
شاہنشہِ انبیاء رسول عربی ﷺ

''راحل مرحوم ہی کی کہی ہوئی مندرجہ ذیل تاریخ گرامی کے لوح مزار پر کندہ کی گئی:

''مزار۔ حضرت گرامی'' ''۱۹۲۷ء'' [۲۹]

مولانا گرامی قلندرانہ طبیعت کے مالک تھے ، بے نیازی ان کی ذات کا حصہ تھی۔ شہرت وستائش سے بے پروا تھے۔ مولانا گرامی کی قادرالکلامی کے سبب ان کا شہرہ ہُوا ، اور انھیں ادبی محفلوں ، جلسوں اور مشاعروں میں مدعو کیا جانے لگا لیکن گرامی کی بے نیازی نے کبھی انھیں اہم نہ جانا ، سید عابد علی عابد لکھتے ہیں :

''مولانا گرامی کی غزلوں کی شہرت ہوئی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ جالندھر میں ایک ایسا نغمہ سرا ہے جو عرفی نظیری ، کلیم و طالب اور بیدل و غالب کی یاد تازہ کرتا ہے تو ہر طرف سے فرمائش ہونے لگی کہ وہ جلسوں میں اپنا کلام

سنائیں لیکن گرامی نہایت مستغنی المزاج، قلندر بخش اور درویش صفت شاعر تھے جی میں آیا تو چلے گئے نہیں تو جلسے والے آس لگائے بیٹھے رہے۔'' ۳۰

حفیظ جالندھری مولانا گرامی کی شخصیت کا تذکرہ اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہیں:

''میں نے اپنی زندگی میں لاکھوں نہیں تو ہزاروں شاعر دیکھے اور سینکڑوں سے ملاقات ہوئی، لیکن شعر سے ایسا انہماک کسی دوسرے شاعر میں مجھے نظر نہیں آیا۔ فنافی اللہ لوگ شاید بہت سے ہوں لیکن فنافی الشعر جسے کہنا چاہیے، وہ میری دانست میں گرامی ہی تھے۔ خلوت ہو یا جلوت، اٹھتے بیٹھے وہ کسی مصرعے کی دھن میں رہتے تھے۔ بظاہر اپنے ملاقاتیوں کی باتوں کا جواب دیے جا رہے ہیں لیکن گم ہیں کسی مصرعے کے جوڑ توڑ میں..... جب شعر ہو جاتا تو ان کی آنکھیں روشن ہو جاتیں اور وہ اس شعر کو اپنے نزدیک بیٹھنے والے کو سُنانے سے باز نہ رہتے لیکن ایک عجیب بات تھی، جو میں نے اب تک صرف انھی میں دیکھی۔ وہ اپنا شعر سُنا کر داد طلب نہ ہوتے۔ شعر سُنانے کے ساتھ ہی پھر کسی لفظ یا مصرعے میں گم ہو جاتے..... وہ شاعری کے لیے پیدا ہوئے تھے زندگی بھر اسی میں محو رہے۔ اپنی تعریف اور تعارف سے بے نیاز تھے۔'' ۳۱

حفیظ جالندھری تمام عمر اس فخر کی کیفیت سے سرشار رہے کہ انھیں گرامی کی شاگردی نصیب ہوئی اور انھوں نے علم و دانش کے اس سرچشمے سے بے پناہ فیض حاصل کیا۔ وہ بتاتے ہیں کہ ان پر ایک دور ایسا بھی آیا کہ جب وہ داغ کے رنگ میں بری طرح رنگے جا رہے تھے۔ سامعین و قارئین ان کی اس روش سے بے انتہا خوش، انھیں داد سے نوازتے، یہ بھی اس زعم میں مبتلا کہ ایک روز، زمانے کو داغ بن کر دکھا دیں گے، کہ مولانا گرامی نے آڑے ہاتھوں لیا اور بزبانِ پنجابی یہ بات اچھی طرح سمجھا دی کہ داغ کے نقال بننے سے بہتر ہے کہ تم اپنی اصل شکل میں ظاہر ہو۔ ۳۲

حفیظ جالندھری نے اس وقتی دل شکنی کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، ہمیشہ خوب سے خوب تر کہنے کی کوشش کی مگر اپنے انداز سے اور اس مقام تک آ گئے کہ ان کا اسلوب ان کی شناخت ٹھہرا۔ ایک مرتبہ ایسا بھی ہُوا کہ علامہ اقبال نے ان کا کلام سن کر یوں داد دی:

''تمھارے اشعار میں جو سادگی اور صفائی پائی جاتی ہے اس پر یقیناً مولانا گرامی کی استادانہ توجہ کا اثر ہے، گرامی کا یہ تم پر بہت بڑا احسان ہے۔'' ۳۳

حفیظ جالندھری، گرامی سے آخری ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ استاد گرامی کی طبیعت زیادہ خراب تھی، بمشکل تمام انھیں مردانے میں لایا گیا مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور میرا سر اپنے سینے پر رکھ کر یہ بات کہی'' ہمیں یقین تھا کہ حفیظ گرامی کو دیکھنے ضرور آئے گا۔'' علامہ اقبال کو یاد کرتے رہے۔ مولانا اس وقت اپنے وطن کی محبت میں سرشار تھے۔ شدید بیمار تھے لیکن آہستہ آہستہ یہ شعر پڑھتے جاتے تھے، مولوی عظامی اور میں سُن رہے تھے۔

اے گرامی بحیرتم چہ کسی
جادو انگیز آتشیں نفسی
منت عمر و زید ہاں تا چند

مگس خوانِ این و آں تاچند
نظم دلکش بخواں بطرزِ دگر
مولدِ تست شہرِ جالندھر
ذرہ اش بر ستارہ چشمکِ زیر
خاک ِ جالندھر است مردم خیز[۳۴]

مولوی عبد الحق ''چند ہم عصر'' میں اپنے معاصرین کا تعارف اختصار کے ساتھ لیکن اتنے جامع انداز میں کراتے ہیں کہ صاحبِ خاکہ کی شخصیت کے سارے پہلو قاری سے متعارف کرا دیتے ہیں ، ان کے نزدیک گرامی ''سچے شاعر'' تھے۔ فکرِ شعر میں ہمہ وقت محو رہنے والے ، اور شعر پڑھنے کا انداز ایسا کہ یوں معلوم ہوتا کہ شعر کے جگر میں مدغم ہوتے جاتے ہیں۔ مولوی صاحب بھی اس بات کے شاہد ہیں کہ صورت اور وضع قطع سے انھیں شاعر ماننے میں تامل ہوتا تھا لیکن جب وہ شعر پڑھتے ،تب ان کے جواہر عیاں ہوتے ۔ دوستوں سے بے تکلفی اور قدر دانی ان کے مزاج کا حصہ تھی۔ فارسی اشعار ٹھیٹ پنجابی لہجے میں اس طرح سناتے کہ لطف دے جاتا۔[۳۵]

ڈاکٹر خاور نگرامی ،شعر سُننے سنانے کے حوالے سے ان کے ایک دلچسپ معمول کا ذکر کرتے ہیں :

''ان کی زوجہ اقبال بیگم، فارسی اور اردو زبان کی شاعرہ تھیں ۔ میاں بھی بہرے تھے اور بیوی بھی گراں گوش تھیں ۔ کہتے ہیں کہ جب یہ دونوں ایک دوسرے کو اپنا کلام بہرے ہونے کی وجہ سے چیخ چیخ کر سناتے تو راستہ چلنے والوں کا اژدہام (ازدحام) ہو جاتا اور باہر سے سامعین داد دیتے ۔ گرامی کے گھر پر اکثر میلہ لگا رہتا۔'' ۳۶

اردو شاعری سے بھی لگاؤ تھا، شعر کے فنی و معنوی محاسن فوری طور پر نظر میں آ جاتے ، اگر ان کے فارسی کلام کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اسے کسی بھی فارسی شاعر کے کلام کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے تو اردو کلام بھی ان عظمت و انفرادیت میں اپنی مثال آپ ہے، یہ الگ بات کہ انھوں نے اردو شاعری کی طرف بہت کم توجہ کی ، وہ بولتے اور سوچتے پنجابی ، یعنی اپنی مادری زبان میں تھے لیکن شعر گوئی کے لیے انھوں نے زبان شیریں ، فارسی کا ہی انتخاب کیا اور وہ پاک و ہند میں فارسی غزل گوئی کے سلسلے کی آخری کڑیوں میں سے ایک تھے ۔ طویل بحر میں کہی گئی ان کی اس اردو غزل میں موسیقیت ، غنائیت ، نغمگی نے موضوع کے تاثر اور تاثیر میں اضافہ کیا ہے ملک محمد باقر نسیم نے شعرائے ء پنجاب کے صفحہ ۳۲ پر گرامی کے اردو شعر درج کیے ہیں، جو انھوں نے اقبال کی درج ذیل غزل سے متاثر ہو کر فی البدیہہ کہے تھے

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباس ِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

گرامی کے اشعار میں اپنی ذات سے الٰہیات تک کے اس سفر میں حیات و ممات تک کے تمام مراحل ، ان کی مذہب سے وابستگی اور انسان کا مجبورِ محض ہونا سبھی کیفیات موجود ہیں ۔

نہ وہ دل رہا نہ وہ آرزو، یہ کشش ہے کیا ترے نیاز میں
اسے کون کہتا ہے بت شکن وہ جو دل ہے زلفِ ایاز میں
مری زندگی مری موت ہے مری موت ہے مری زندگی
مرا جسم ظلمتِ ہند میں مری روح خاکِ حجاز میں [۳۷]

گرامی مذہباً و مشرباً اہلِ تشیع تھے یا اہلِ تسنن، یہ ایک الگ بحث ہے۔ حضرت علیؓ سے عقیدت و محبت ان کی تخلیقات میں اپنی جھلک دکھاتی ہے۔

محرمِ نکتہء خفی و جلی
جانشینِ محمد ست علی

تو دیگر خلفائے راشدین بھی آپ کے نزدیک اتنے ہی محترم و مکرم ہیں۔

گرامی بلبلِ باغِ بہارم
نوا سنج مدیح چار یارم
محیط یکدلی را چار گوہر
ابو بکر و عمر، عثمان و حیدر [۳۸]

مولانا گرامی کی وفات ایک بڑا سانحہ تھا۔ حفیظ نے بھی تاریخِ وفات کے قطعات کہے اور راحل نے بھی۔

''۔۔۔اور بھی کئی شاعروں نے تاریخیں کہیں لیکن حفیظ ہوشیار پوری کے بڑے بھائی مولوی عبدالرشید راحل مرحوم کے یہ قطعات تاریخ میں بہت مشہور ہوئے۔

گرامی کہ در آخر عمر زیست — بہ خاک طربناک ہوشیار پور
ہمہ خاک شد منزلش بعد مرگ — بجو سالش از ''خاک ہوشیار پور'' ۱۳۴۵ھ

دیگر

رفت مولانا گرامی از جہاں — گر مء بزم سخن باقی نماند
راحل مغموم سالش گفت ''ہائے — آں قدح بشکست و آں ساقی نماند'' ۱۳۴۴ فصلی [۳۹]

جب ۲۲ مئی ۱۹۲۷ء کو مولانا گرامی کا انتقال ہُوا تو حفیظ ہوشیار پوری نے صرف پندرہ برس کی عمر میں فی البدیہہ یہ شعر کہا۔

صبا بہ حضرت اقبال ایں پیام دہ
برفتِ جانِ گرامی و تو ہنوز خموش

حفیظ کے اس شعر کو بہت سی شخصیات نے علامہ اقبال سے منسوب کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ نے گرامی کی یاد میں پہلی بار فارسی میں مرثیہ لکھا اور یہ یادگار تاریخیں بھی کہیں۔

صد حیف کہ آں شاعر نامی ز جہاں رفت　　آں غیرت سعدی و نظامی زجہاں رفت
چوں شیخ گرامی، زجہاں رفت بگفتم　　تاریخ ہمیں ''شیخ گرامی زجہاں رفت'' ۱۹۲۷ء

رہا شد از قفسِ آب و گل گرامیء ما　　مبارک اہل طلب رانشمین فردوس
چو او برفت بگوشِ حفیظ ہاتف گفت　　کہ ''رفتہ روحِ گرامی بہ گلشنِ فردوس'' ۱۹۲۷ء

بیتاب تھے فردوس میں سعدی و نظامی　　آیا ملک الموت کی صورت میں پیامی
پہنچا درِ فردوس پہ جب شاعر یکتا　　رضواں نے کہا ان سے کہ ''حاضر ہیں گرامی'' ۱۳۴۵ھ[۴۰]

خواجہ عبدالرشید، ''تذکرۂ شعرائے پنجاب'' میں گرامی کی وفات کا تذکرہ تفصیل کے ساتھ رقم کرتے ہیں۔ ''بعد از وفات نظام دکن میر محبوب علی، میر عثمان علی خان بہ جانشینی او رسید واز گرامی خواہش کرد کہ ہوشیار پور را ترک گفتۂ وارد حیدرآباد دکن شود۔ مہاراجا سرکرشن پرشاد ہم نامہ ای بہمین موضوع بہ گرامی فرستاد و از و خواہش کرد کہ فرمائشِ نظام عثمان را قبول کند۔ ولے گرامی بعلت مرض ذیابیطس معذرت خواست و بالآخرہ درسال ۱۹۲۷ء عرصۂ وجود را ترک گفت۔ بموقع وفات خود رباعی زیر ورد زبانش بود۔

می میرم و دیدہ اشکباری دارد　　دل خوں شدہ جاں نفس شماری دارد
ای چارہ شناس کار با مرہم نیست　　این صید بسینہ زخم کاری دارد

گرامی ہوش و ذکاوت فوق العادہ ای رادارا بود و بیشتر کلام خود از برداشت بیشتر شعر ہایش تا ہنوز چاپ نگردیدہ است۔ غزلیات و رباعیات کہ دیوان مختصر راتشکیل میدھد چندین بار چاپ گردیدہ است۔ گرامی داری سلیقہ و ذوق مخصوص بود ونسبت بہ بزرگان مذہب ارادت خاصی را داشت۔ با علامہ اقبال لاہوری دوست بود ومعمولاً بمنزلش میرفت۔ راجع با اقبال چنیں گفتہ است:

در دیدۂ معنی نگہبان حضرت۔ اقبال
پیغمبری کرد و پیمبر نتواں گفتی [۴۱]

گرامی اپنی زندگی کی آخری سانس تک اقبال کا انتظار کرتے رہے، اس کا تذکرہ کئی دوستوں نے کیا:

مرض الموت میں بھی مولانا گرامی نے پیغام بھیجا کہ قریب مرگ ہوں، اقبال اور سالک(۶) سے کہو کہ آ کر مجھے دیکھ جائیں۔'' لیکن افسوس اس امر پر کہ مکروہات وموانع دنیاوی نے مہلت نہ بخشی۔ [۴۲]

گرامی کی وفات پر تمام ادبی جرائد اور اخبارات نے ان کی عظمت کا اعتراف کیا، مخزن اس عہد کا سب سے اہم

ادبی جریدہ تھا مخزن کا گرامی نمبر، اس محبت کا آئینہ دار ہے جو ان کے معاصرین کے دلوں میں، ان کے لیے موجود تھی۔

جس گرامی کے متعلق، اقبال نے کہا تھا کہ گرامی مسلم ہے اور مسلم تو دہء خاک نہیں کہ خاک اسے جذب کر سکے، لیکن جسم کو تو خاک ہونا ہی ہے، خاک میں ملنا ہی ہے، قبرستان کندن شاہ کی خاک کو یہ اعزاز حاصل ہُوا کہ گرامی ابدی نیند سو رہے ہیں لیکن ان کے افکار و اشعار ہمیشہ ادبِ عالیہ کا حصہ رہیں گے۔

علامہ اقبال گرامی کے سانحہء ارتحال پر غم زدہ و رنجور حالت میں ہوشیار پور گئے اور اس موقع پر کہا گیا قطعہ ان کے غم و اندوہ کا آئینہ دار ہے اور ساتھ ہی گرامی کی فکرِ رسا، فلسفیانہ خیالات و صنعت گری کو خراجِ تحسین بھی اور دوستی کا اعتراف بھی.....

''آہ مولانا گرامی از جہان بر بست رخت

آنکہ زد فکر بلندش آسماں را پشت پای

معنی مستورِ او در لفظِ رنگینش نگر　　مثل حوری بی حجاب اندر بہشت دلکشای

از نوای جان فزای او عجم را زندگی　　جام جمشید از شرابِ ناب او گیتی نمای

یادِ ایامی کہ با او گفتگو ھا داشتم　　ای خوشا حرفی کہ گوید آشنا با آشنای

بر مزارش پست تر کن پردہ ہای ساز را

تا نہ گردد خوابِ او آشفتہ از شورِ نوای''[۴۳]

اہلِ علم کے لیے گرامی کی رخصت ایک دَور کا خاتمہ تھا کہ اب کوئی اس پائے کا فارسی داں شاعر نہیں رہا تھا۔ اقبال بیگم ترک ان کے ادبی و علمی قد و قامت سے بھی آگاہ تھیں، ان کے لیے تو زندگی کا سارا حسن اور تکمیل گرامی ہی سے تھی۔

کہے کوئی انا الحق ہم انا المحبوب کہتے ہیں

سر اپنا، شور اپنا، شوق اپنا، مدعا اپنا

یہ وہی اقبال بیگم ترک ہیں جن کے لیے اقبال مذاقاً کہا کرتے تھے کہ لوگ تو جورو کو بیاہ کر لاتے ہیں، گرامی کو جورو بیاہ کر لے گئی۔[۴۴]

سید عابد علی عابد کہتے ہیں:

'' برصغیر پاک و ہند میں فارسی کلاسیکی شاعری کا آخری ترجمان گرامی تھا اس کے بعد تو چراغ ہی گُل ہوگیا۔''[۴۵]

عقل و عشق کا موازنہ اور عشق کی فوقیت علامہ اقبال کا خاص موضوع رہا ہے، عقلِ حیلہ ساز کے فریب سے گرامی بھی آگاہ ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ گرامی کے اس شعر نے مجھے تڑپا دیا۔ ساری زندگی کتابوں کی ورق گردانی کرتے گزرتی اور آخر میں کھُلا کہ یہ سب حیلہ فروشی و مدعا طلبی ہے، کتابی علم سے عقل بے شک بڑھ جاتی ہے لیکن دل روشن نہیں ہوتا۔

کتابِ عقل ورق در ورق فرو خواندیم
تمام حیلہ فروشی و مدعا طلبی است [۴۶]

حواشی

۱۔ قدر بلگرامی: والیِ دکن نواب محبوب علی خان کے دربار سے وابستہ' فارسی شاعری میں بادشاہ کے استاد تھے۔CANNING COLLEGE لکھنوء میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ متعدد کتابوں کے مصنّف تھے۔ نثر بھی بہت اچھی لکھتے تھے، محقق بھی تھے اور علومِ عروض کے ماہر بھی۔ فارسی قواعد پر ان کی کتاب ، بنیادی اہمیت کی حامل ہے۔

۲۔ عزیز الدین عظامی:۔ مولانا گرامی کے تلامذہ میں حفیظ جالندھری اور عزیز الدین عظامی بہت شہرت رکھتے ہیں ۔عظامی نے فارسی شاعری میں نام پایا۔ عظامی تاریخ گوئی کا خصوصی ملکہ رکھتے تھے۔ آپ کے اساتذہ میں دیوبند کے نامور علما شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور مولانا سیّد انور شاہ کشمیری شامل ہیں ۔ جامعہ پنجاب سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور جالندھر کے ایک ہائی سکول میں فارسی کے استاد مقرر ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ساہیوال آ گئے۔ اور گورنمنٹ ہائی سکول میں فارسی کی تعلیم دینے لگے ۔۱۹۵۳ء میں ریٹائر ہوئے اور ۱۹۵۷ء میں ساہیوال میں انتقال ہُوا' حفیظ ہوشیار پوری نے تاریخ کہی ۔عزیز الدین عظامی از جہاں رفت مولانا محمد معظم شاہ والدِ محترم مولانا محمد انور شاہ شیخ الحدیث، دیو بند وفات ۔۲۸ فروری ۱۹۵۸ء ۲۷ ذوالحجہ ۱۳۵۶ھ (دوشنبہ) ''انتقال معظم شاہ'' ۵۸۲ +۱۳۵۶=۱۹۳۸ء(''بے زبانی زباں نہ ہو جائے، حفیظ ہو شیار پوری، شخصیت اور فن'' قرۃالعین طاہرہ،ص۲۷۵۔'' فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ''ڈاکٹر صدیق شبلی'ڈاکٹر ریاض احمد،ص۲۳۸)

۳۔ غنیمت کنجاہی: ضلع گجرات پاکستان میں فارسی نظم میں سب سے زیادہ شہرت مولانا غنیمت کی ہے جن کی مثنوی ''نیرنگِ عشق'' مختلف ناموں سے مشہور ہے ۔'' مثنوی شاہد وعزیز''''مثنوی مولانا غنیمت'' مثنوی شاہد وفا'' وغیرہ ۔راقمہ کے ذاتی کتب خانے میں دیوانِ غنیمت با اہتمام محمد تیغ بہادر اور مولانا غنیمت کنجاہی کی مثنوی ''نیرنگِ عشق'' جسے مطبع نولکشور سے جولائی ۱۸۸۰ء میں شائع کیا گیا' موجود ہے ۔ خان صاحب قاضی فضل حق ''مقالاتِ قاضی فضل حق'' میں رقم طراز ہیں''..... اس مثنوی کے علاوہ دیوانِ غزلیات اور مثنویات بھی ان کی یادگار یں ہیں۔ دیوان کسی وقت ہندوستان میں چھپا تھا مگر اب نایاب ہے ۔ میرے پاس خوش قسمتی سے اس کا چھوٹی تقطیع کا بہت خوش خط قلمی نسخہ ہے جو مولانا کے وطن سے دستیاب ہُوا تھا اور بعض قرائن سے پایا جاتا ہے کہ خود مولانا کی دستی تحریر ہے .....مولانا کا وطن اور مولد قصبہ کنجاہ ہے ۔ ان کے والد کا نام محمد مکرم تھا اور'' مفتی'' کے لقب سے مشہور تھے ..... اپنے ہی وطن میں تعلیم پائی ..... شاعری میں مولانا کو میر محمد زمان راسخ لاہوری سے تلمذ تھا اور روحانی طور پر ان کی بیعت سلسلہء قادریہ نوشاہیہ میں تھی .....مولانا کا انتقال بقول روایات زبانی ۱۱۱۷ھ میں اور'' غم و الم'' مادہ ء تاریخ وفات بتایا جاتا ہے ۔(فضل حق' قاضی خان صاحب'ء'' مقالاتِ خان صاحب قاضی فضل حق'' ص۱۱۲۔۱۱۰)

۴۔ اسد ملتانی: محمد اسد خان نام قوم افغان شیرانی سے نسبت ۔ خان غلام قادر خاں کے فرزند ۳ دسمبر ۱۹۰۲ء کو کڑی افغان ملتان میں پیدا ہوئے۔ چرچ مشن ہائی سکول سے میٹرک کیا ۔ ۱۹۲۴ء میں گورنمنٹ کالج سے بی اے کیا ۔ سائنس و فلسفہ سے گہری دلچسپی تھی ۔ عملی زندگی کا آغاز مدّرسی سے کیا۔ ہفت روزہ ''الشمس'' اور سائنسی ماہنامہ ''روشنی'' کے ناموں سے دو پرچوں کا آغاز کیا ۔ ۱۹۲۶ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی ۔ وزارتِ خارجہ میں ڈپٹی سکریٹری کے عہدے تک پہنچے۔ شعر وادب سے لگاؤ تھا۔ غزلیں بھی کہیں لیکن بنیادی طور پر نظم کے شاعر تھے ۔ اقبال سے بے حد متاثر تھے اور پیروی ءِ اقبال پر نازاں بھی ۔ ان کی وہی نظمیں رین کہی جا سکتی ہیں جن میں رنگِ اقبال نمایاں ہے ۱۹۵۹ء میں انتقال ہوا۔ (قریشی، محمد عبداللہ، ''معاصرین اقبال کی نظر میں'' ص ۴۷۹)

۵۔ راحل ہوشیار پوری: ''حفیظ ہوشیار پوری کے برادر بزرگ، راحل ہوشیار پوری بطور ایک شاعر اور تاریخ گو کے، قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور جالندھر اور اس سارے علاقے میں اردو لسانیات میں مستند تصوّر کیے جاتے تھے۔'' قائدِ اعظمؒ کی وفات پر راحل مرحوم نے حسبِ ذیل مادہ تاریخ نکالا۔

''آہ قائد اعظم مرد''

راحل کا نمونہ ءِ شعر:

گھول دے جام میں ان مدبھری آنکھوں کا سرور
میرے ساقی ترا راحل ابھی سرشار نہیں

خواجہ عبدالرشید تذکرہ شعرائے پنجاب میں جناب راحل ہوشیار پوری کا تفصیلی تعارف کرواتے ہیں۔ 'شیخ عبدالرشید متخلص بہ راحل پسر شیخ فضل محمد خان و برادر بزرگ حفیظ ہوشیار پوری بود کہ احوالش درین تذکرہ مرقوم گردیدہ است۔ وی درسال ۱۹۰۲ ء میلادی درہوشیار پور متولد و درسال ۱۹۵۳ء میلادی در لاہور فوت و مدفون گردید۔ وی یکی ازشاگردان غازی عبدالرحمٰن امرتسری وتحت تاثیر عقائد سیاسی وی قرار گرفتہ بود۔ راحل درتاریخ گوئی وشعر پارسی مہارت بسیار عجیبی رادارابودو علاقہ خاصی رانسبت بصوف داشت۔' (خواجہ عبدالرشید ۱۹۶۷ء تذکرہ شعرائے پنجاب کراچی اقبال اکادمی ۴۲۵)

۶۔ عبدالمجید سالک: پیدائش ۱۳ دسمبر ۱۸۹۳ء بٹالہ ضلع گورداس پور، وفات ۲۷ دسمبر ۱۹۵۹ء۔ خوش گفتاری، حاضر جوابی و شگفتہ مزاجی اور طنز و مزاح میں اپنی مثال آپ تھے ۔ ''روز نامہ انقلاب'' کے مدیر تھے۔ افکار و حوادث کے عنوان سے لکھے گئے، آپ کے کالم بہت شوق سے پڑھے جاتے تھے ۔ ''سرگذشتِ سالک'' کے نام سے آپ بیتی تحریر کی ۔ علامہ اقبال سے خاص تعلقِ خاطر تھا ۔ (صادق نسیم ''روشنی چراغوں کی'' ص ۷۸)

حوالہ جات

۱۔ قریشی، محمد عبداللہ، ''معاصرین اقبال کی نظر میں''، ص ۱۸۷

۲۔ ظہور الدین، ڈاکٹر احمد، ص ۱۱۱

۳۔ تسبیحی، محمد حسین، ص ۳۷

۴۔ نگرامی، خاور، ص ۱۶

۵۔ ایضاً

۶۔ ایضاً

۷۔ ایضاً

۸۔ ظہور الدین، ڈاکٹر احمد، ص ۱۱۱

۹۔ صادق نسیم، ''روشنی چراغوں کی'' ص ۲۴۔۲۳

۱۰۔ حفیظ جالندھری، '' استادِ گرامی مرحوم'' مشمولہ: ''ماہ نو''، ص ۲۰۳

۱۱۔ قریشی، محمد عبد اللہ، ''معاصرین اقبال کی نظر میں''، ص ۱۹۶

۱۲۔ محمد ریاض، ڈاکٹر، ''اقبال لاہوری و دیگر شعراء فارسی'' ص ۱۳۲

۱۳۔ لکھنوی، صہبا، ص ۲۰۱

۱۴۔ قریشی، محمد عبد اللہ، ''معاصرین اقبال کی نظر میں''، ص ۱۹۷

۱۵۔ تقی عابدی، سید، ص ۶۷

۱۶۔ مرزا جلال دین، ''میرا اقبال''، مشمولہ: ابو للیث صدیقی، '' ملفوظاتِ اقبال حواشی و تعلیقات''، ص ۹۷۔۹۸

۱۷۔ فیاض محمود سید، عابدی وزیر الحسن، ص ۳۹۵

۱۸۔ حسن انوشہ، ص ۲۱۰۱

۱۹۔ قریشی، محمد عبد اللہ، ''معاصرین اقبال کی نظر میں''، ص ۱۹۵

۲۰۔ محمد ریاض، ڈاکٹر، شبلی ڈاکٹر محمد صدیق، ''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ'' ص ۲۳۲

۲۱۔ خان، سعادت علی، بزمِ اقبال، مشمولہ ابو للیث صدیقی، '' ملفوظاتِ اقبال حواشی و تعلیقات''، ص ۲۴۳

۲۲۔ نذیر نیازی، سیّد، ص ۱۷۳

۲۳۔ قریشی، محمد عبد اللہ، ''معاصرین اقبال کی نظر میں''، ص ۴۸۳

۲۴۔ حفیظ، جالندھری، '' استادِ گرامی مرحوم'' مشمولہ: ''ماہ نو''، ص ۲۰۳

۲۵۔ فیاض محمود سید، عابدی وزیر الحسن، ص ۴۹۹

۲۶۔ محمد ریاض، ڈاکٹر، ڈاکٹر محمد صدیق شبلی، ''فارسی ادب کی مختصر ترین تاریخ'' ص ۲۳۲

۲۷۔ نسیم، صادق، ص ۲۳

۲۸۔ ظفر،نوید،ص۲۳۱

۲۹۔ قریشی،محمد عبداللہ،''معاصرین اقبال کی نظر میں''ص۴۹۔۴۸

۳۰۔ عابدعلی عابد،سید،ص۱۰۶۴

۳۱۔ حفیظ،جالندھری،''استادِ گرامی مرحوم'' مشمولہ:''ماہ نو''،ص۲۰۵۔۲۰۴

۳۲۔ محمد منور،مرزا،ص۱۵۷

۳۳۔ ایضاً

۳۴۔ فاروقی،محمد حمزہ،ص۲۳۷۔۲۳۶

۳۵۔ عبدالحق،مولوی،''چند ہم عصر''ص۱۰۹

۳۶۔ خاور،نگرامی،ص۱۷

۳۷۔ نسیم،ملک محمد باقر،شعرائے پنجاب،ص۳۲

۳۸۔ ظہور الدین'ڈاکٹر احمد'ص۱۱۲

۳۹۔ قریشی،محمد عبداللہ،''معاصرین اقبال کی نظر میں''ص۴۹۔۴۸

۴۰۔ صہبا لکھنوی،''فن اور فنکار'' مشمولہ:''افکار''،حفیظ نمبر،ص۹۴۔۹۵

۴۱۔ عبدالرشید،ص۳۰۹

۴۲۔ سالک،عبدالمجید،اداریہ،''انقلاب''

۴۳۔ محمد ریاض،ڈاکٹر،''اقبال لاہوری و دیگر شعرای فارسی'،ص۱۳۳

۴۴۔ قریشی،محمد عبداللہ،''معاصرین اقبال کی نظر میں''،ص۱۸۸

۴۵۔ عابدعلی عابد،سیّدص۱۰۶۴

۴۶۔ قریشی،محمد عبداللہ،''معاصرین اقبال کی نظر میں''،ص۲۰۵